مفکرین پیدا کیجیے

(تنظیمِ اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب)

جناب پروفیسر سید محمد سلیم (تنظیمِ اساتذہ پاکستان)

ایک طرف تو دینی تعلیم اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ ہے۔ یہ مسلسل جاری ہے۔ گھر پر والدین اولاد کو دینی احکام پر عمل پیرا ہونے کی نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ درس گاہوں میں اساتذہ نیکی اور بھلائی کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ مسجدوں میں، خطبات میں اور درسوں میں یہی نصیحت ملتی رہتی ہے۔ اخبارات اور رسائل میں مختلف تقریبات کی مناسبت سے مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا ماحصل بھی یہی ہوتا ہے کہ دینی احکام کا اتباع کیا جائے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے درسِ قرآن اور دینی مذاکرات نشر ہوتے رہتے ہیں جن کا ماحصل بھی دینی احکام کی پیروی پر اُبھارنا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اور سالوں سے ہوتا آیا ہے، لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اتنی ساری پیہم کوششوں کے نتیجے میں اتباع اور پیروی عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتی۔ انگریزی تہذیب کے غلبہ کے بعد سے دینی احکام کی پابندی زوال پذیر ہے۔ بے عملی اور بے دینی کی رَو روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

دوسری جانب مغربی تہذیب کی یلغار ہے جو انگریز کے چلے جانے کے بعد بھی روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ آزادی کے بعد سے اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ انگریز نے ایک دن بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم انگریزی لباس پہنو، انگریزی بال رکھو، انگریزی رہائش اختیار کرو، خواتین سے یہ نہیں کہا کہ تم بے پردہ ہو جاؤ، اپنے جسم کے حصوں کی نمائش کرتی پھرو، بال کٹاؤ، کسی دن براہِ راست انگریز نے اپنے افکار کی تبلیغ و اشاعت نہیں کی۔ مگر انگریز کی نقالی کی رفتار میں دن دُگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ آزادی کے بعد

تو گھریلو زبان میں انگریزی الفاظ گھس آئے ہیں۔ مثلاً انکل، آنٹی، لٹریچر وغیرہ جیسے الفاظ اب روزمرہ بن گئے ہیں۔ گلی کے نکڑ پر چوڑیاں بیچنے والا شخص بھی اپنی دکان پر "بینگل شاپ" کا بورڈ آویزاں کرتا ہے۔ درآنحالیکہ وہ خود ناخواندہ ہے، جو خواتین یہاں آتی ہیں وہ سب ناخواندہ ہوتی ہیں۔ پھر بھی بورڈ انگریزی میں ہیں۔

یہاں بجا طور پر ایک سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک جانب باوجود کوشش کے عمل ندارد یا بہت کم ہے۔ دوسری جانب بغیر کوشش کے عمل کی رفتار بہت تیز ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ اس کی کیا وجوہات ہیں؟ صدیوں سے مسلمان علماء اور واعظین کہتے چلے آرہے ہیں کہ مسلمانوں کا زوال اسلامی احکام پر عمل درآمد نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ بلاشبہ مرض کی یہ تشخیص درست ہے، مگر کافی نہیں ہے۔ مزید یہ بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ اسلامی احکام پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟ اس میں عدم توجہی کیوں ہے؟ اگر آغاز ہی میں یہ تشخیص کر لی جاتی۔ صحیح مرض اور خرابی کی نشاندہی کر دی جاتی تو پھر بہت پہلے علاج شروع ہو جاتا اور بہت پہلے زوال کی رو کو مؤثر انداز میں روکا جاسکتا تھا۔ بہت پہلے اسلامی پیش قدمی کا آغاز ہو چکا ہوتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی فرد ہو وہ منفرد زندگی نہیں گزارتا۔ بے تعلق اور سب سے کٹ کر زندگی بسر نہیں کرتا۔ وہ ہر حال میں ایک گھرانے، کنبے اور برادری کا جزو ہوتا ہے۔ اس کی سوچ کنبے، برادری اور معاشرے سے باہر نہیں جاتی۔ قیدِ تنہائی میں بند قیدی بھی اپنے گھر، کنبے اور برادری سے متعلق افکار و خیالات میں غلطاں اور پیچاں رہتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب انسان کی سوچ منفرد نہیں ہے تو اس کا عمل منفرد، کٹا ہوا اور غیر مربوط کیسے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ میں شامل ہر فرد معاشرہ میں رائج اور مقبول افکار و اقدار کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ ہر فرد معاشرہ میں مقبول معیاری افکار و اعمال سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے کی شعوری اور لاشعوری کوشش میں مشغول رہتا ہے۔ جو افکار و اقدار معاشرہ میں غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کو ایک ایک فرد اختیار کر لیتا ہے اور جو افکار و اقدار معاشرہ میں غلبہ حاصل نہیں کر پاتے یا شکست کھا جاتے ہیں ان کی قدر افراد معاشرہ کی نگاہ میں گر جاتی ہے۔

لوگ ان کو ترک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ بے پردگی ذلت کی علامت شمار ہوتی تھی۔ جس کو ایک عورت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ جہانگیر بادشاہ کی بیگم نورجہاں اپنے محل کی چھت پر کھڑی تھی ۔ قریب سے ایک دیہاتی گزر رہا تھا، اس نے بیگم کو دیکھ لیا۔ بیگم کو اپنی بے پردگی کا احساس اس قدر شدید ہوا کہ اس نے شدتِ جذبات میں اس دیہاتی پر طپنچہ داغ دیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ معاشرتی اقدار آج کے دور میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ آج کی نورجہاں حسنِ صورت اور حسنِ صوت کا مظاہرہ کرتی پھرتی ہے۔ اور اس پر وہ خوش ہے۔ آج معیارِ مقبول تبدیل ہو گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ معاشرہ میں شامل فرد معاشرہ میں رائج اور مقبول افکار و اقدار سے متاثر ہوتا ہے۔ ان سے مربوط رہتا ہے۔

جس دور میں اسلامی تہذیب کا اور اسلامی اقدار کا ہمارے معاشرہ میں غلبہ تھا۔ کوئی اس کا مقابل اور مزاحم نہیں تھا، اس دور میں صرف اسلامی احکام کا پیش کر دینا کافی تھا۔ تب علماء کا وعظ و نصیحت کر دینا بالکل کافی تھا۔ لیکن آج ہمارے معاشرہ پر مغربی تہذیب اور مغربی افکار کا غلبہ ہے۔ ہر سال جدید درس گاہوں سے لاکھوں لڑکے اور لڑکیاں مغربی اقدارِ حیات کا درس لے کر معاشرہ میں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ مغربی افکار و اقدار کو پھیلاتی رہتی ہیں اور قدیم اسلامی رنگ کو پھیکا بناتی رہتی ہیں۔ ان حالات میں نصیحت کرنے والوں کی تعداد خواہ کتنی ہی کثیر ہو، صرف یہ کہتے رہنا کافی نہیں ہے کہ اسلامی احکام پر عمل کرو۔

بدقسمتی سے گذشتہ ڈیڑھ صدی سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اسلامی احکام کے پسِ پردہ اسلامی اقدار کی بات کی جاتی۔ اسلامی احکام کی غایات بیان کی جاتیں۔ مغربی اقدار سے ان کا تقابلی موازنہ کیا جاتا۔ دلائل اور براہین سے مغربی اقدار پر ان کی برتری واضح کی جاتی۔ نوجوان مغربی تعلیم یافتہ نسل کو عقلی طور پر مطمئن کیا جاتا۔ ان کے شکوک و شبہات رفع کیے جاتے۔ اگر یہ سب کچھ کیا جاتا تو نئی نسل ضرور بالضرور ایسے علماء کے گرد جمع ہو جاتی اور ان کے ارشادات کی پیروی کرتی۔

علامہ اقبال نے سب سے پہلے ہمارے ملک میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہوں نے مغربی تہذیب پر تنقید کی اور اسلامی اقدار کی تائید کی۔ عقل و خرد سے بات کی۔ ان کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ ان

کے اقوال کو سند کے طور پر پیش کیا جانے لگا ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہی طریقہ اختیار کیا علمی میدان میں انہوں نے مغربی افکار و اقدار کو چیلنج کیا ۔ غیر مرعوبانہ انداز میں بات کی ۔ عقلی اور فکری انداز میں اسلامی احکام کی حکمتیں بیان کیں ۔ ان کی برتری واضح کی ۔ عقل کی ہدایت پر وحی کی ہدایت کی برتری واضح کی ۔ ایک خلق نے ان کے افکار کو سنا اور پڑھا ۔ اور پھر ان کے گرد جمع ہوگئی ۔ ان کی کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوئے ۔ وہاں کے لوگ بھی ان افکار و خیالات سے متاثر ہوئے ۔

یہ دور عقلی انداز میں بات کرنے کا ہے ۔ اسلامی احکام کی حکمتیں بیان کرنے کا ہے ، دلیل اور برہان سے بات کرنے کا ہے ۔ تقابلی انداز میں بات کرنے کا ہے ۔ مغربی درس گاہوں سے کھیپ در کھیپ نکلنے والے طلبہ یہ کام نہیں کر سکتے ۔ مغرب کے نرے مقلد یہ کام نہیں کر سکتے ۔ اسلام کے مومن اور مغرب کے نقاد مسلمان یہ کام سر انجام دے سکتے ہیں ۔ غور و خوض کرنے والے مسلمان یہ کام کر سکتے ہیں ۔ دلائل اور براہین تلاش کرنے والے یہ کام کر سکتے ہیں ۔ ایمانِ راسخ اور فکرِ صالح رکھنے والے یہ کام کر سکتے ہیں ۔

پس اے معزز گروہِ اساتذہ ! مخلص مومن اور دقیقہ رس حقیقت بیں طلبہ پیدا کیجیے ۔ رو میں بہنے والے نقالوں سے کام نہیں چلے گا ۔ طبع زاد مفکرین کی ضرورت ہے ۔ اس لیے غلبۂ اسلام کی تڑپ طلبہ کے دلوں میں پیدا کیجیے ۔ پھر دماغوں میں فکرِ اسلامی کے سوتے پھوٹیں گے ۔ ان کی آبیاری کیجیے ۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھیے اور اپنا فریضہ انجام دیجیے ۔